رفعت سروش کی خودنوشت 'بمبئی کی بزم آرائیاں': ایک جائزہ

روشنی خان

شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی، موبائل:9967694393

رفعت سروش کا شمار اردو کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جن کے زورِ قلم نے بہ یک وقت نثر و نظم کی مختلف اصناف میں اپنی طباعی کے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے اردو کے تخلیقی منظرنامہ کو اپنی گوناگوں تخلیقات سے کچھ اس انداز میں مزین کیا کہ ارباب نقد و نظر کی پذیرائی اور ادب کے عام قاری کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ رفعت سروش اپنے عصری ادبی رجحانات سے متاثر رہے، لیکن اس طرح نہیں کہ ان کی نگارشات کو سکہ بند ادب کے زمرے میں محدود کر دیا جائے۔ وہ جس زمانے میں ادبی دنیا سے متعارف ہوئے وہ زمانہ ترقی پسند تحریک کا زریں دور تھا اور اس تحریک سے وابستہ ادب کے قدآور ادبا و شعرا سے انھیں شرف نیاز بھی حاصل رہا اور ان شخصیات سے مختلف صورتوں میں کسب فیض نے رفعت سروش کے ادبی ذوق کو جلا بخشی، لیکن انھوں نے اپنی نگارشات کو تخلیقیت کے ان نظری حدود و قیود سے آزاد رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی جن سے ادب کی جمالیاتی قدروں کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی شاعری کا ایک حصہ اس قسم کی انقلابی شاعری پر مشتمل ہے جو ترقی پسند تحریک کے دور عروج میں ایک ایسے رجحان کی حیثیت اختیار کر گئی تھی جس کی پیروی سے گریز کرنے والے شاعر کو عموماً قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اپنی تخلیقی زندگی کے ایک محدود سے عرصہ میں انھوں نے اس رجحان کی پیروی کی اور اس کے بعد اس رجحان کا رنگ بتدریج ان کی شاعری سے کم ہوتا گیا۔ رفعت سروش کی ادبی زندگی کا ابتدائی دور ان کی ریاضت شعر سے عبارت ہے، لیکن جیسے جیسے اس دور کو وسعت حاصل ہوتی گئی ان کی ادبی شخصیت کے متنوع پہلو آشکار ہوتے گئے اور شعر و نثر کی مختلف اصناف کے قلمی سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا۔ انھوں نے بہ طور شاعر غزل و نظم لکھنے کے علاوہ طویل نظم نگاری میں بھی کامیاب طبع آزمائی کی۔ طویل نظم نگاری پر فنکارانہ دسترس کے سبب انھیں منظوم ڈراموں اور اوپیرا نگاری میں بھی کامیابی ملی۔ اسی لیے اس طرز کی تخلیقات میں ان کے یہاں نثری ڈراموں کی بہ نسبت منظوم ڈراموں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ تنقید سے بھی ان کی فطری دلچسپی کا اظہار ان کی تخلیقی زندگی کے آغاز سے ہی نظر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس فن کی طرف ان کی توجہ بڑھتی گئی اور انھوں نے اس ضمن میں کئی کتابیں ارباب ادب کے سامنے پیش کیں۔ تنقید اور تخلیق کے مختلف جہانوں کی سیر کرنے کے علاوہ انھوں نے ان شخصیات پر بھی مضامین لکھے جن سے ان کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق رہا۔ اس طرز کے مضامین نے انھیں خاکہ نگاری کی ترغیب دی۔ جس کے نتیجے میں انھوں نے مختلف ادبی شخصیات پر خاکے بھی لکھے۔ انھوں نے جن شخصیات پر خاکے لکھے ان کی قلمی تصویر کچھ اس انداز سے بنائی کہ شخصیت کا ہر وہ جز نمایاں ہو سکے جو اس شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور ادب یا کسی دوسرے شعبہ میں اس کی حیثیت و مرتبہ کو واضح کرتا ہو۔ رفعت سروش نے غیر افسانوی نثر میں شمار ہونے والی ایک اہم اور مقبول صنف خودنوشت کے تحت تین کتابوں میں اپنی زندگی کے مختلف ادوار کے احوال رقم کیے ہیں۔

رفعت سروش کی خودنوشت کا پہلا حصہ 'بمبئی کی بزم آرائیاں' کے عنوان سے ۱۹۸۶ء میں نورنگ کتاب گھر، منیر کا نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کی خودنوشت کا دوسرا حصہ 'اور بستی نہیں یہ دلی ہے' کے نام سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس سلسلے کی اگلی کڑی کے طور پر ان کی خودنوشت کا تیسرا حصہ 'پتا پتا بوٹا بوٹا' ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آیا۔ رفعت سروش کی زندگی کے شب و روز کے احوال پر مبنی ان تین خودنوشتوں میں ان کی شخصیت اور ان کے عہد کی ادبی سرگرمیوں کا قدرے مفصل بیان ملتا ہے۔ انھوں نے ان خودنوشتوں کے ذریعہ اردو کے خودنوشت نگاروں میں اپنا ایک نمایاں اور اہم مقام بنایا۔ رفعت سروش نے خودنوشت نگاری کی عام روش کے بجائے فنی سطح پر اپنی الگ راہ بنائی اور ان کے اس تجربہ کو ادب میں خاصی پذیرائی بھی حاصل ہوئی۔ خودنوشت نگاری کا عام طرز یہ ہے کہ لکھنے والا جب اپنی زندگی کے آخری ایام میں پہنچتا ہے تو اپنی سابقہ زندگی کے ان شب و روز کی روداد کتابی شکل میں مرتب کرتا ہے جن میں اس کی شخصیت کی تشکیل اس مخصوص نہج پر ہوئی جو اس کی شہرت و ناموری اور قدردانی کا وسیلہ بنا۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی

انجام دینے والی شخصیات نے جو خودنوشتیں یادگار چھوڑی ہیں وہ ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنے کے ساتھ ہی ان کے عہد کی سماجی و تہذیبی صورتحال کی عکاسی بھی کرتی ہیں ۔اگر خودنوشت نگار کا بنیادی تعلق ادب سے ہوتو لازمی طور پر اس کی خودنوشت کا بیشتر حصہ ادب سے متعلق ان مباحث پر مشتمل ہوگا جن سے معاصر ادبی منظرنامہ ترتیب پاتا ہے۔اس اعتبار سے دیکھیں تو رفعت سروش کی خودنوشتوں میں بھی بیشتر حصہ ان کی ادبی سرگرمیوں اور ان کے عہد کے ادبی آثار و احوال پر مبنی ہے تاہم ان کتابوں میں معاصر تہذیب وثقافت اور سیاست و معاشرت کے نقوش بھی جابجا نظر آتے ہیں۔

رفعت سروش کی خودنوشتوں کی اشاعت کی ترتیب کے لحاظ سے ان کی زندگی کی روداد کا بیان معکوسی نوعیت کا حامل ہے۔اس سلسلے کی آخری کڑی کے طور پر جو کتاب بہ عنوان 'پتا پتا بوٹا بوٹا' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی اس میں ان کی زندگی کے ابتدائی ایام کا احوال ملتا ہے۔یہ خودنوشت ۱۲۶/ صفحات پر مشتمل ہے۔بمبئی اور دلی کی زندگی کی تفصیل بیان کرنے کے بعد ان کو یہ احساس ہوا کہ ان کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت کے متعلق معلومات کا ایک بڑا حصہ اب بھی اپنے بیان کا متقاضی ہے لہٰذا انھوں نے اسے ارباب ادب کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے خودنوشت کا یہ تیسرا حصہ شائع کیا۔یہ خودنوشت ۱۴ مختصر ابواب پر مبنی ہے۔رفعت سروش نے اس کتاب میں ۱۹۴۵ء تک کے اپنی زندگی کے واقعات بیان کیے ہیں اور چونکہ اس کے بعد کا احوال بمبئی کی بزم آرائیاں میں درج ہے لہٰذا زمانی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ خودنوشت نگاری کے ذیل میں 'پتا پتا بوٹا بوٹا' کی حیثیت پہلے حصے کی سی ہے جس کا دوسرا حصہ بمبئی کی بزم آرائیاں اور تیسرا حصہ 'اور بستی نہیں یہ دلی ہے' کو قرار دیا جا سکتا ہے۔رفعت سروش کی خودنوشت نگاری کے ذیل میں اس کتاب کو ان کی خودنوشت کا دوسرا حصہ قرار دینا چاہیے۔رفعت سروش نے ۱۹۵۸ء میں بمبئی کو خیر باد کہہ کر جب دلی کا رخ کیا تو پھر یہ شہر ان کا مستقل مسکن بن گیا۔اس کتاب میں انھوں نے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۹۲ء تک کے دور کے حالات و واقعات قلمبند کیے ہیں۔یہ کتاب اپنے عہد کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ تحریر کے دائرۂ کار اور تفصیل کے معاملے میں بھی وسعت رکھتی ہے۔یہ خودنوشت ۴۶۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۹۳ء میں اس کی اشاعت نورنگ کتاب گھر نئی دہلی کے ذریعہ عمل میں آئی۔اس خودنوشت کی اشاعت میں ترقی اردو بورڈ کا مالی تعاون بھی شامل رہا۔اس خودنوشت کو انھوں نے مختلف عنوانات کے تحت ۱۳۵ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔اس کے علاوہ کتاب میں حرف آغاز اور مختلف اشخاص اور شخصیات کا اشاریہ بھی ۳۵ صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔اس اشاریہ کے متعلق رفعت سروش نے حرف آغاز میں وضاحت کی ہے کہ اس کی ترتیب ڈاکٹر رضیہ حامد کے ذریعہ کی گئی ہے۔ان کی یہ خود نوشت کتابی شکل میں شائع ہونے سے قبل قومی آواز کے دہلی ایڈیشن میں قسط وار شائع ہوئی، لیکن کچھ عرصہ بعد اخبار کے بند ہو جانے کے سبب یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔اس سلسلہ کو دوبارہ شروع کرنے میں رفعت سروش کے دوست اور 'آزاد ہند' (کلکتہ) اور 'اجالا' کے ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی نے اسباب فراہم کیے اور ہفتہ وار ''اجالا' میں اسے سلسلہ وار شائع کرنا شروع کیا۔رفعت سروش نے اپنی زندگی کا جو دور دلی میں بسر کیا اس میں ان کی ادبی زندگی میں پختہ کاری کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ریڈیو، ادب اور سیاست سے متعلق متعدد شخصیات کا حقیقت پسندانہ بیان اس کتاب کو دستاویزی اہمیت کا حامل بنا دیتا ہے۔رفعت سروش کی تینوں خودنوشتوں کے درمیان اس حصے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اگر چہ اس کتاب کی مرکزی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تاہم اس سلسلے کی پہلی کڑی کے طور پر 'بمبئی کی بزم آرائیاں' کو اس آغاز کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے جس نے رفعت سروش کو خودنوشت نگاری کے ذیل میں اس قدر تفصیل سے اپنی زندگی کی روداد تین کتابوں کی شکل میں پیش کرنے کی تحریک عطا کی۔

رفعت سروش کی یہ خودنوشت ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ کتاب ۱۹۸۶ء میں نورنگ کتاب گھر نئی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔انھوں نے اس کتاب میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۸ء تک کے زمانے کے حالات و واقعات بیان کیے ہیں۔اس خودنوشت میں انھوں نے کوئی پیش لفظ یا عرض مصنف لکھنے کا اہتمام نہیں کیا ہے۔انھوں نے اس خودنوشت میں خصوصی طور پر ترقی پسند تحریک، آل انڈیا ریڈیو اور فلم انڈسٹری سے وابستہ افراد کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنی زندگی کی روداد بڑے دلچسپ اور شگفتہ انداز میں اس خودنوشت میں بیان کی ہے۔رفعت سروش نے اس خودنوشت کا انتساب سید ذوالفقار علی بخاری کے نام معنون کیا ہے۔اس خودنوشت میں ترقی پسند تحریک کی سربرآوردہ شخصیات سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، ظ۔انصاری، باقر مہدی سے اپنے مراسم نیز ان شخصیات کی ادبی زندگی کے مختلف واقعات انھوں نے بڑے دلچسپ اور حقیقت پسندانہ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔اس خودنوشت کا وہ حصہ بھی ادبی اعتبار سے بہت اہم ہے جس میں رفعت سروش نے ریڈیو سے متعلق بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں اپنے

تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ ہندی کے مشہور شاعر نریندر شرما اور بھوانی پرساد مشر کے بارے میں بھی رفعت سروش نے اپنے تاثرات اس خود نوشت میں پیش کیے ہیں۔

اس کتاب کے آغاز میں رفعت سروش نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اس کے وجود میں آنے کا سبب ان کے دوستوں کا وہ اصرار رہا جس میں بار بار ان سے خودنوشت لکھنے کی فرمائش کی جاتی رہی اور بالآخر اس کے نتیجہ میں ۱۶۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مرتب ہوئی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ مجھے بیتے دنوں کا حساب دینا ہوگا۔ ورنہ میں بھی بڑے لوگوں کی طرح ڈائری لکھتا اور اب ان کی کڑیاں جوڑ کر مضمون تیار کر دیتا، مگر اب دوستوں کے اصرار پر اپنی یادداشتیں قلمبند کرنے بیٹھا ہوں تو ذہن میں ۵/اگست ۱۹۴۵ء کی بھیگی بھیگی سہ پہر ابھر آئی ہے جب میں عروس البلاد بمبئی کے وی ٹی اسٹیشن پر اترا تھا۔''[1]

رفعت سروش کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی یہ خودنوشت مکمل طور پر ان کی یادداشت پر مبنی ہے۔ اس طرز سے خودنوشت لکھنے کا عمل خودنوشت نگار کے لیے کسی حد تک دقت طلب ضرور ہوتا ہے کہ اس کے پاس ڈائری میں درج روداد یا نوٹس کی شکل میں کوئی ایسی بنیاد نہیں ہوتی جس پر وہ خودنوشت کی شکل میں ایک مربوط و منظّم متن اس طور سے تیار کر سکے جس میں کسی پہلو کے نظر انداز یا فراموش ہونے کا امکان نہ ہو۔ ممکن ہے کہ اس کتاب میں بھی بعض باتیں دائرۂ تحریر میں آنے سے رہ گئی ہوں، لیکن رفعت سروش نے اپنی یادداشت کی بنیاد پر جو کچھ بھی تحریر کیا ہے اس سے اس عہد کی بمبئی کی ادبی و ثقافتی زندگی کا ایک ایسا خاکہ مرتب ہو جاتا ہے جو بہت واضح اور نمایاں ہے۔ اس کتاب میں رفعت سروش نے اپنی شخصیت کے حوالے سے بمبئی کی روزمرہ زندگی کے ان واقعات کو قلمبند کیا ہے جن کا تعلق ان کے حصول روزگار اور ادبی سرگرمیوں میں ان کی فعال شرکت سے رہا ہے۔ بمبئی آنے سے قبل وہ دہلی میں مختلف قسم کی ملازمتیں کر چکے تھے اور چونکہ اس زمانہ میں ہندوستانی سماج میں فلموں کی مقبولیت کا دائرہ روز بہ روز وسیع ہوتا جا رہا تھا اور اس ضمن میں خصوصی طور سے شعر و ادب سے تخلیقی سطح پر وابستہ افراد فلموں میں نغمہ نگار کے طور پر شہرت حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھے لہٰذا رفعت سروش نے بھی اس شعبہ میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا اور دہلی کو خیر باد کہہ کر بمبئی کی راہ لی۔ بمبئی آنے کے اس مقصد کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے 'بمبئی کی بزم آرائیاں' میں لکھا ہے:

''میرا بمبئی جانے کا مقصد سیر و تفریح نہیں بلکہ کسب معاش تھا۔ یوں تو ۱۹۴۳ء میں بمبئی کے مختلف دفتروں میں نوکری کر چکا تھا اور یہاں نوکری کی کمی نہ تھی، مگر جو چیز مجھے کھینچ کر بمبئی لے گئی وہ تھی فلموں میں گانے لکھنے کی آرزو۔ ۱۹۴۵ء تک میں اچھے خاصے معیاری ادبی رسالوں میں چھپنے لگا تھا اور دہلی اور کبھی کبھی بیرون دہلی کے مشاعروں میں اپنے کلام کی داد حاصل کر لیتا تھا اس لیے شوق چرایا کہ فلمی گانے لکھے جائیں۔''[2]

رفعت سروش نے اس شوق کی تکمیل کے لیے جو جد و جہد کی اس میں انھیں بہت زیادہ کامیابی نہ حاصل ہو سکی تاہم اس شہر میں رہتے ہوئے ان کی وابستگی کچھ ایسے افراد اور مشاغل سے ہوئی جن سے ان کے ادبی ذوق کو جلا حاصل ہوئی اور ادب میں ایک نمایاں مقام بھی حاصل ہوا۔ اس شہر میں ان کا پہلا ٹھکانہ ڈونگری کے اطراف کا وہ علاقہ تھا جو 'کھڑک' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہاں ان کے بڑے بھائی امتیاز احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ 'زینب چیمبرس' کی ایک چھوٹی سی کھولی میں رہتے تھے اور یہی کھولی اس شہر میں رفعت سروش کی پہلی قیام گاہ بنی۔ انھوں نے فلموں میں گیت لکھنے کی اپنی جد و جہد جاری رکھتے ہوئے دیگر چھوٹے موٹے کام کرتے رہنے کا سلسلہ جاری رکھا تاکہ معاشی اعتبار سے انھیں کسی ایسے مسئلے کا سامنا نہ کرنا پڑے جو اس شہر میں ان کے مزید قیام کو مشکل بنا دے۔ کسب معاش کا کوئی موزوں ذریعہ تلاش کرنے اور اس شہر کی ادبی دنیا سے اپنا رابطہ بنائے رکھنے میں رفعت سروش نے ایک ایسا توازن قائم کر لیا تھا کہ دونوں پر ایک دوسرے کے اثرات اس طور سے نہ مرتب ہو سکیں جو ہر دو میں سے کسی ایک کے لیے بھی نقصان کا سبب بن جائے۔ شخصیت کے ان دو رنگوں میں توازن و تناسب کے سبب ہی رفعت سروش کو بمبئی کی ادبی دنیا میں نمایاں مقام ملا اور ساتھ ہی کسب معاش کی صورت میں آل انڈیا ریڈیو میں ایک معیاری ملازمت بھی حاصل ہوئی۔ بمبئی سے قبل دہلی میں رہتے ہوئے بھی وہ اسی روش پر کار بند رہے جس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ذریعۂ معاش اور ادبی مشاغل کو میں نے دہلی میں بھی الگ الگ رکھا تھا اور بمبئی میں بھی یہی روش اختیار کی۔ ایک حیثیت سے میری شخصیت کے یہ دو متوازی روپ تھے۔ دہلی میں سرکاری دفتروں میں نوکری کرتا تھا اور ادیبوں اور انقلابی دوستوں کے ساتھ شامیں گزارتا تھا۔ مجاز ان میں سے ایک تھا۔ بمبئی آ کر جس انقلابی شخصیت کی مجھے سب سے پہلے تلاش ہوئی وہ تھے سردار جعفری۔ دہلی سے چلتے وقت مجاز نے سردار

جعفری کے نام ایک تعارفی پرچہ دیا تھا اور ان الفاظ میں سردار کا غائبانہ تعارف کرایا تھا کہ سردار جعفری ترقی پسندوں کا جعفر علی خاں ہے۔''[۳]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رفعت سروش نے معاشی جد و جہد اور ادبی سرگرمیوں میں توازن کا انداز اپنے دہلی قیام سے ہی اختیار کر رکھا تھا۔ دوسری اہم بات جو اس اقتباس سے ظاہر ہوتی ہے وہ ترقی پسند تحریک کے سیاق میں علی سردار جعفری کی شخصیت کے اس پہلو کو نمایاں کرتی ہے جس کی بنا پر انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد اس تحریک کے ادبی پیشوا کی حیثیت اختیار کر لی تھی تاہم مجاز کے پرچہ کے توسط سے رفعت سروش کی ملاقات جس سردار جعفری سے ہوئی وہ اس زمانے میں اپنی حیثیت منوانے کی جد و جہد میں مصروف تھے۔ سردار جعفری سے ملاقات کے بعد تحریک کے ادبی پروگراموں میں رفعت سروش کی باقاعدہ شرکت ہونے لگی اور ان پروگراموں میں وہ اپنی اس طرز کی انقلابی شاعری بھی پیش کرنے لگے جس کی تشہیر و تبلیغ ترقی پسند تحریک سے وابستہ قلمکاروں کے لیے نصب العین کی حیثیت رکھتی تھی۔ دراصل تحریک کے ان ادبی پروگراموں کو رفعت سروش کی ادبی شخصیت کے بنانے اور سنوارنے میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس زمانے میں شہر بمبئی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ممتاز شخصیات کا مسکن بنا ہوا تھا اور ان شخصیات نے اس شہر میں رہتے ہوئے شعر و ادب کی تخلیق کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی کے لیے عملی طور پر جو خدمات انجام دیں وہ اس تحریک کا ایک اہم باب ہے۔ اس تحریک سے وابستہ نمایاں اور ممتاز شخصیات نے رفعت سروش کی تخلیقی صلاحیتوں کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے انھیں شعر و ادب میں اپنے تخلیقی جوہر کو پیش کرنے کے مواقع فراہم ہوتے رہے۔ 'بمبئی کی بزم آرائیاں' میں رفعت سروش نے ان شخصیات اور ان سے وابستہ ان واقعات کا قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے جو ان کی تخلیقی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کا وسیلہ بنے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سردار جعفری کے علاوہ سجاد ظہیر، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، سبط حسن، ڈاکٹر کنور محمد اشرف، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جاں نثار اختر اور حمید اختر کے علاوہ ان دیگر ارباب ادب کا ذکر کیا ہے جنھوں نے شعر و نثر میں اپنی نگارشات کے ذریعہ قابل قدر اضافہ کیا اور ساتھ ہی کمیونسٹ پارٹی کو عوامی مقبولیت عطا کرنے میں عملی طور پر سرگرم رہے۔ ان شخصیات میں سجاد ظہیر کی حیثیت سب سے اہم اور نمایاں تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کو مقبول و مستحکم بنانے میں انھوں نے تاریخی کردار ادا کیا تھا۔ رفعت سروش ان کی شخصیت سے حد درجہ مرعوب و متاثر رہے اور اس کا ذکر مختلف واقعات کے سیاق میں اپنی خودنوشت میں بھی کیا ہے۔ سجاد ظہیر سے ان کا لگاؤ عقیدت کی حد تک تھا اور ان کی علمی و عملی استعداد کا اعتراف کرنے میں رفعت سروش نے کسی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔

رفعت سروش نے اس خودنوشت میں ترقی پسند تحریک کی اس تاریخی کانفرنس کا احوال بھی قدرے تفصیل سے اور دلچسپ پیرایے میں لکھا ہے جو ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی۔ چونکہ یہ سال بمبئی میں ان کے ورود کا پہلا سال تھا اور اس کانفرنس کے انعقاد تک وہ آل انڈیا ریڈیو کی اس ملازمت سے بھی وابستہ نہیں ہوئے تھے جو آگے چل کر ان کی شہرت اور مصروفیت کا سبب بنی لہٰذا وہ بھی بمبئی کے ترقی پسند کارواں کے ساتھ حیدرآباد کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے۔ اس کانفرنس میں شرکت سے رفعت سروش کو ان دیگر ارباب ادب سے بھی ملاقات کا موقع حاصل ہوا جو بمبئی کے علاوہ ملک کے دوسرے شہروں میں اس تحریک کو مقبول بنانے میں سرگرم تھے۔ ان میں شاعر، افسانہ نگار، ڈراما نگار، تنقید نگار گویا کہ ادب کی متنوع صورتوں کے مزاج داں شامل تھے۔ ان میں وہ ادیب اور شاعر بھی تھے جو اس وقت اپنی حیثیت مسلم کر چکے تھے اور کچھ وہ بھی تھے جو اپنی شناخت قائم کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ اس کانفرنس میں شامل ہونے والی نمایاں شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے رفعت سروش نے لکھا ہے:

''ہمارا قافلہ اگلے دن صبح کو حیدرآباد پہنچا اور کانفرنس کی چہل پہل شروع ہو گئی۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے شاعر و ادیب آئے تھے۔ بے باک اور بے لاگ گفتگو کرنے والے مولانا حسرت موہانی، غزل اور تنقید کو نیا موڑ دینے والے فراق گورکھپوری، بھاری بھرکم نقاد پروفیسر احتشام حسین، شعلہ نفس دانشور ڈاکٹر علیم، کلکتہ کے شاعر پرویز شاہدی، بھوکا ہے بنگال کے خالق وامق جونپوری، ادب لطیف کے ایڈیٹر ساحر لدھیانوی، نیا دور (بنگلور) کے ایڈیٹر صمد شاہین اور ان کی نئی نویلی بیگم ممتاز شیریں، انگریزی ناول نگار اور ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ایک ڈاکٹر ملک راج آنند اور حیدرآباد کے تو سبھی شاعر و ادیب کانفرنس میں موجود تھے۔[۴]

اردو میں ترقی پسند تحریک کو مقبول بنانے میں اس کانفرنس کا نمایاں کردار رہا ہے۔ حالانکہ اس کانفرنس کے دو سال بعد جب ملک آزاد ہو گیا اور اس تحریک سے وابستہ ادبا و شعرا دو ملکوں ہندوستان و پاکستان کی جغرافیائی حدود کے پابند ہو گئے تو اس تحریک کی مرکزیت اور اثر پذیری کے طور طریقے بھی بدل گئے۔ ہندوستان میں اس تحریک کو جاری و ساری

رکھنے کا بیڑہ سردار جعفری نے اٹھایا، لیکن ان کی قیادت میں اس تحریک میں نظریاتی اختلافات نے جو شدت اختیار کی اس کا بڑا سبب بعض کے نزدیک سردار جعفری کا اپنی شخصیت کے تئیں خود پسندی کا وہ رویہ بھی رہا جو کسی دوسرے کو اپنا ہم پلہ تسلیم کرنے سے گریز کرتا ہے۔ سجاد ظہیر کی شخصیت میں قائدانہ صلاحیت جس انداز کی تھی سردار جعفری کے یہاں اس معیار و انداز کا فقدان تھا اور دوسرے یہ کہ انھیں اس تحریک کے توسط سے اپنی شہرت و ناموری کی فکر ہمیشہ گھیرے رہتی تھی جس کے لیے وہ حسب ضرورت اسباب و وسائل جمع کرنے میں منہمک رہتے تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے رفعت سروش نے لکھا ہے:

''سردار کے ہاتھ میں انجمن کی زمام آتے ہی اس کے رنگ ڈھنگ بدلنے لگے اور آہستہ آہستہ وسیع النظری اور ادبی رواداری میں کمی آنی شروع ہوئی، مگر اس کا احساس شروع شروع میں اس لیے نہیں ہوا کہ ملک کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے اور بین الاقوامی تبدیلیوں کا دباؤ بھی انجمن کی کارکردگی پر پڑنا لازمی تھا۔ اب 'مقصدیت' کی سلپ ہر تخلیق کے ماتھے پر چپکائی جانے لگی اور ادبی محاسن کو طاق میں رکھنے کا چلن شروع ہوگیا۔''[۵]

رفعت سروش نے ترقی پسند تحریک کے ادبی سروکار میں رونما ہونے والی اس تبدیلی کا بیان انتہائی راست گوئی سے کیا ہے جو بالآخر اس تحریک کی عدم مقبولیت کا سبب بنی۔ رفعت سروش کی یہ خودنوشت ان کی ذات کا بیانیہ ہونے کے ساتھ ہی معاصر ادبی صورتحال کی ایک ایسی روداد پیش کرتی ہے جو ترقی پسند تحریک کے عروج اور گزران وقت کے ساتھ اس میں پیدا ہونے والے زوال کے آثار سے عبارت ہے۔ رفعت سروش کی اس خودنوشت کا جو دورانیہ ہے وہ ۱۳ برسوں کو محیط ہے جس میں ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی اور اس تحریک کے سفر میں پیش آنے والے ان مراحل کو خصوصی حیثیت حاصل ہے جو ان کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں اہمیت کے حامل رہے۔ اس خودنوشت میں ترقی پسند تحریک کے قدرے تفصیلی بیان کے علاوہ رفعت سروش کی پیشہ ورانہ زندگی خصوصاً آل انڈیا ریڈیو میں ان کی ملازمت کے علاوہ بمبئی کے ان واقعات و حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے جن کے اثرات سماجی، تہذیبی اور سیاسی سطح پر اس شہر پر پڑے۔

رفعت سروش کی آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت ذوالفقار علی بخاری کی کرم فرمائی کا نتیجہ تھی جس کا اعتراف اس خودنوشت میں واضح انداز میں کیا گیا ہے۔ رفعت سروش نے بمبئی میں آنے کے بعد شروع کے کچھ دنوں تک مختلف قسم کی چھوٹی بڑی ملازمتیں کیں اور اسی دوران ان کی ملاقات حبیب تنویر سے ہوئی جن کے توسط سے ان کی رسائی ذوالفقار علی بخاری تک ہوئی جو ریڈیو اسٹیشن میں ان کے حصول ملازمت میں مددگار ثابت ہوئے۔ رفعت سروش کے لیے یہ ملازمت عملی زندگی کے ان تجربات سے دوچار ہونے کا ذریعہ بنی جن کے بغیر شاہراہ حیات کے پیچ و خم آشکار نہیں ہوتے۔ رفعت سروش نے اس خودنوشت میں اپنی ملازمت کے حوالے سے اس سیاست کا بھی ذکر کیا ہے جس نے آزاد ہندوستان میں لسانی تنازع کو ہوا دی اور بالآخر اس کا خمیازہ اردو جیسی سیکولر اور مقبول خاص و عام زبان کو اٹھانا پڑا۔ ریڈیو کی نشریات پر بھی اس تنگ نظر سیاست کا اثر ہوا اور آزادی سے قبل جس 'ہندوستانی سیکشن' کے تحت ادبی پروگرام نشر کیے جاتے تھے اب وہ 'ہندی' اور 'اردو' کے دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ اس صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے رفعت سروش نے لکھا ہے:

''میرے ذہن و نظر اس بات کے شاہد ہیں کہ ہندی اور اردو کے معاملے میں بڑی تیزی سے انقلابی تبدیلیاں ہوئیں اور ریڈیو ہی کیا پورے ملک میں اردو کی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ بمبئی ریڈیو اسٹیشن پر ہندی اور اردو پروگراموں کا تناسب ۸۰ اور ۲۰ قرار پایا اور اس کا باقاعدہ حساب ہیڈ کوارٹر میں بھیجنا ہمارے فرائض میں شامل ہوگیا۔''[۶]

رفعت سروش کا یہ مختصر سا بیان اس عصبیت زدہ لسانی سیاست کا نقشہ پیش کرتا ہے جس کے اثرات آج بھی ملک میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں اور فی الوقت صورتحال یہ ہے کہ اس مسئلے کا شمار ہندوستانی سماج کے ان پیچیدہ ترین مسائل میں ہوتا ہے جن کے سبب معاشرتی اتحاد کی جڑیں روز بہ روز کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ رفعت سروش نے اس مسئلے کا صرف مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ ریڈیو کی ملازمت کے دوران وہ خود ایسے کئی تجربات سے دوچار ہوئے جو اردو کی سماجی وابستگی کا دائرہ محدود کرنے کا سبب بنے۔ اس خودنوشت میں انھوں نے کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ طور پر ان واقعات و حالات کا بیان کیا ہے جو اردو کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوئے۔ اس خودنوشت میں جس عہد کا ذکر ہے وہ زمانہ ملک میں آزادی کی جدوجہد کے آخری مرحلے سے شروع ہو کر وطن کی آزادی اور تقسیم وطن کے واقعات سے گزرتا ہوا ملک میں قائم ہونے والے اس سیاسی نظام تک پہنچتا ہے جس کی بنیاد جمہوری اقدار پر استوار ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود اس میں کچھ ایسی کمیاں در آئی تھیں جو مذہب، قوم، علاقہ اور زبان کے معاملات میں فتنہ انگیز عناصر کو سر اٹھانے کی آزادی فراہم کرتی تھیں۔ آزادی اور تقسیم وطن کے وقت ملک میں ہونے والے فرقہ وارانہ

فسادات نے بمبئی کو بھی متاثر کیا اور چونکہ اس زمانہ میں رفعت سروش کا قیام اسی شہر میں تھا۔ لہٰذا اس خودنوشت میں فسادات سے متعلق ان خوں چکاں واقعات کا بھی ذکر ہے جن کے سبب اس ملک کی صدیوں پرانی اتحاد و یکجہتی کی روایت کو نقصان پہنچا۔ آزادی اور تقسیم کے سبب ہندوستانی معاشرہ میں مذہب اور قوم کی بنا پر جس طرز سیاست کا چلن عام ہوا اس نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ سرکاری ملازمتوں سے وابستہ افراد بھی اس کی زد میں آئے اور ان کی تقرری اور تبادلے میں ان کی ذات اور مذہب کی بنا پر فیصلے ہونے لگے۔ آل انڈیا ریڈیو بھی عصبیت کے اس رجحان سے محفوظ نہ رہ سکا جس کا اثر مختلف صورتوں میں رفعت سروش کی ملازمت پر بھی پڑا۔ اس ضمن میں انھوں نے بعض واقعات کا ذکر راست طور پر کیا ہے اور بعض کو اشاروں، کنایوں میں بیان کیا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن کی پالیسی پر لسانی و مذہبی سیاست کے اثر انداز ہونے کی صورت میں ان کے دہلی تبادلے کے اسباب مہیا ہوئے اور انھیں بمبئی کو خیر باد کہہ کر دہلی کی راہ لینی پڑی۔ خودنوشت میں اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''بمبئی میرے خوابوں کا شہر، بمبئی میری آرزوؤں اور تمناؤں کا شہر، بمبئی میری زندگی کی جولانگاہ، بمبئی میری شوریدہ سری کا گواہ، بمبئی میری لغزشوں کا رازدار۔ بہت دن سے مشورے ہو رہے تھے کہ وودھ بھارتی کے ساتھ مجھے بھی بمبئی سے دہلی بھیج دیا جائے گا اور یہ شہر رنگ و آہنگ، یہ شہر حرکت و عمل ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گا اور ستم یہ کہ میں خود بھی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو گیا تھا۔''[۷]

آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت نے انھیں ایک بار دہلی پہنچا دیا جہاں وہ بمبئی آنے سے قبل کچھ برسوں تک معاشی اور ادبی اعتبار سے سرگرم رہ چکے تھے۔ یہ خودنوشت رفعت سروش کی زندگی کے ان ۱۳ برسوں کا احاطہ کرتی ہے جو انھوں نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۸ء تک بمبئی میں گزارے۔ اس کے بعد کی ان کی زندگی کا احوال 'اور بستی نہیں یہ دلی ہے' میں مرقوم ہے اور اس میں بھی انھوں نے اپنے دلی کے قیام کے دوران کے ادبی، سیاسی ذاتی زندگی کے ان واقعات کو بیان کیا ہے جن سے واقفیت کے بغیر رفعت سروش کی ادبی شخصیت کے خدوخال پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکتے۔ 'بمبئی کی بزم آرائیاں' کا اسلوب سادہ اور برجستہ ہے۔ رفعت سروش نے قدرے آسان زبان میں اپنی زندگی کا احوال رقم کیا ہے۔ واقعات کے بیان میں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا گیا اور واقعات کے مختلف اجزا کے درمیان نظم کو برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے یہ ضرور ہے کہ واقعات کو رقم کرنے میں بعض مقامات پر زمانی ترتیب میں الٹ پھیر نظر آتا ہے، لیکن اس سے واقعہ کے تاثر پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ رفعت سروش نے معاصرین کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنے قلم کو حاسدانہ جذبہ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے اگر کہیں کوئی جملہ یا سطر اس طرح کی لکھی بھی ہے تو بہت محتاط انداز میں کہ معاصرانہ چشمک کا پرتو واضح نہ ہونے پائے۔

'بمبئی کی بزم آرائیاں' کو اردو خودنوشت نگاری کی روایت کی ایک اہم کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس خودنوشت کا اسلوب عام فہم اور واقعات کی پیشکش میں ڈرامائیت اور سریت سے اجتناب برتا گیا ہے اور اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس خودنوشت میں مذکور واقعات بیشتر صداقت پر مبنی ہیں۔ رفعت سروش نے اپنی شخصیت کی پیشکش میں بھی حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے اور بمبئی میں گزارے ہوئے اپنے شب و روز کے ہر اس دورنگ کو پیش کیا ہے جو سکھ اور دکھ، خوشی اور غم، جدوجہد اور کامیابی سے عبارت ہیں۔ اس خودنوشت میں رفعت سروش نے دلچسپ اور معلومات آمیز واقعات کو اپنی ذات کے حوالے سے کچھ اس طور سے پیش کیا ہے کہ ان کی شخصیت کے متنوع پہلو آشکار ہونے کے ساتھ ہی ان واقعات کے وہ اجزا بھی عیاں ہو جاتے ہیں جو ادب، سماج، تہذیب، سیاست اور معیشت کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خودنوشت ہندوستان کے نقشہ پر موجود اس شہر سے بھی واقف کراتی ہے جو قبل آزادی ہی ایک اہم سیاسی، تجارتی اور ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور ملک کے گوشہ گوشہ سے مختلف تہذیب و معاشرت سے تعلق رکھنے والے افراد جوق در جوق اس شہر کی سرزمین پر وارد ہوتے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ جاتے۔

حواشی

۱۔ 'بمبئی کی بزم آرائیاں' ص: ۷، نورنگ کتاب گھر، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء
۲۔ 'بمبئی کی بزم آرائیاں' ص: ۱۰، نورنگ کتاب گھر، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء
۳۔ 'بمبئی کی بزم آرائیاں' ص: ۱۵، نورنگ کتاب گھر، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء
۴۔ 'بمبئی کی بزم آرائیاں' ص: ۲۰۔۲۱، نورنگ کتاب گھر، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء
۵۔ 'بمبئی کی بزم آرائیاں' ص: ۸۰، نورنگ کتاب گھر، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء
۶۔ 'بمبئی کی بزم آرائیاں' ص: ۷۸، نورنگ کتاب گھر، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء
۷۔ 'بمبئی کی بزم آرائیاں' ص: ۱۵۵، نورنگ کتاب گھر، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء

○○

○○